(غلام گردش)

ٹی ذی بادشاہ

کیسے لکھوں کہ طارق زمان فوت ہو چکا ہے۔اسلام آباد میں ایک قبرستان کا مستقل مقیم بن چکا ہے۔بالکل یقین نہیں آتا۔ہرگز یقین نہیں آتا۔1986 میں طالبعلم اسسٹنٹ کمشنر انڈر ٹریننگ ملتان تھا۔کیریئر کی بالکل ابتداء سی تھی۔ایک دن کسی کام سے کمشنر آفس ملتان جانا ہوا۔وہاں افسر ساجد صاحب،کوآرڈینیشن کے اے سی تھے۔اس عہدہ کا نام اے۔سی (جی) ہوا کرتا تھا۔افسر ساجد صاحب بلند پایہ شاعر اور نفیس انسان تھے۔آج کل فیصل آباد میں مقیم ہیں۔خدا انہیں سلامت رکھے۔دفتر میں ایک درمیانے قد کا نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔تعارف ہوا۔یہ امیر طارق زمان ہیں اور حکومت نے انکی پوسٹنگ،کمشنر ملتان کے ساتھ کی ہے۔تھوڑے عرصے بعد،کمشنر انہیں کسی تحصیل میں اے سی لگا دینگے۔ویسے سوچا جائے تو عجیب زمانہ تھا۔کمشنر اتنی طاقتور پوسٹ تھی کہ اسسٹنٹ کمشنر تک بذاتِ خود لگاتا تھا۔کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔معلوم نہیں اب کیا حالات ہیں۔بہر حال جس طرح ہر عہدہ کو آہستہ آہستہ بے بس کیا گیا ہے۔ضلعی اور ڈویژنل انتظامیہ بھی اسی زوال کا لازم جزو ہے۔طارق زمان سے پہلی ملاقات تھی۔ہاں!ایک خاص بات۔اسکے چہرے پر ہر وقت ایک معصوم سی مسکراہٹ موجود رہتی تھی۔افسر ساجد ہی کے کمرے میں مجھ سے پوچھا کہ کہاں قیام ہے یعنی کہاں رہ رہے ہو۔جواب دیا کہ فلاں جگہ۔طارق نے بے ساختہ طریقے سے کہا میں بھی آج تمہاری طرف منتقل ہو رہا ہوں۔یہ بے تکلفی کی انتہا تھی اور میری اس سے بالکل بھی کسی قسم کی بے تکلفی نہیں تھی۔شام کو طارق ایک بکسہ اُٹھا کر میری طرف آ گیا۔اس طرح ہم دونوں روم میٹ بن گئے۔طالبعلمی کا بیشتر حصہ،ہوسٹلوں میں گزارا ہے۔اسلئے مجھے قطعاً کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔معلوم ہوا۔طارق بھی طویل عرصہ ہوسٹلوں ہی کا مسافر رہا ہے۔اتفاقیہ ملاقات سے ہم دونوں روم میٹ اور پھر گہرے دوست بن گئے۔

1986 کی بات کر رہا ہوں۔طارق کی کوشش ہوتی تھی کہ ویک اینڈ پر لاہور آ جائے۔ہفتہ کی دوپہر کو فلائنگ کوچ میں بیٹھتا تھا اور پیر کی صبح تک واپس آ جاتا تھا۔اتنے کم عرصے کیلئے لاہور جانا مجھے مشکل سا لگتا تھا۔لیکن پھر ہم دونوں نے کئی بار اکٹھے لاہور آنا شروع کر دیا۔اصل میں طارق کے دو تین گہرے دوست لاہور رہتے تھے۔انتظار کرتے تھے کہ کب طارق واپس شہر میں آئے۔طارق محفلی قسم کا بندہ تھا۔اسکے تمام دوست،جیسے جودی،نوید چوہدری،نعیم اور دیگر دوست دل سے طارق کا انتظار کر رہے ہوتے تھے کہ کب وہ ملتان سے لاہور آئے۔آہستہ آہستہ یہ تمام لوگ میرے بھی دوست بن گئے۔ایک دن طارق کہنے لگا کہ لاہور شہر کے اندر آنے کے ہزاروں راستے ہیں مگر واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔یہ فقرہ ویسے بے حد مشہور ہو گیا۔طارق کو لاہور سے عشق تھا۔عجیب بات ہے کہ اسے لاہور رہنا کبھی بھی نصیب نہیں ہوا۔وہ ایک کم گو آدمی تھا مگر بولتا تھا تو خوبصورت گفتگو کرتا تھا۔ایک دن میری فون پر بات ہوئی۔پوچھا طبیعت کیسی ہے۔کہنے لگا کہ طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے بس ایک سو تین بخار ہے۔دراصل یہ فقرہ نعیم کا تھا جو کہ کسی بھی محفل میں لمحہ میں غیر سنجیدہ کر دیتا تھا۔اسکے بعد تمام دوست ایک دوسرے کی طبیعت کے متعلق پوچھتے ہوئے یہی کہتے تھے کہ بس ہر طرح سے خیریت ہے بس ایک سو تین بخار ہے۔عرصہ گزر گیا۔اسکے بعد نعیم سے کبھی کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔طارق کے ساتھ خوش گپیاں اور قہقہوں کی

یادگار محفلیں جاری رہتیں۔ دو چار ماہ بعد طارق کا تبادلہ اے سی، حاصل پور ہو گیا۔ جب بھی موقعہ ملتا، میں بھی وہاں جاتا رہتا تھا۔ ویسے ایک چیز مجھے یاد آئی۔ طارق کی نیند بہت کم تھی۔ عمومی طور پر رات کو دو تین بجے تک جاگتا رہتا تھا۔ خیر عمر کے سنجیدہ حصہ میں، رات کو لازوال تصویریں بناتا تھا۔ Miniature Painting میں اسے کمال حاصل تھا۔ ملتان سے میرا تبادلہ شکر گڑھ ہو گیا۔ لہذا طارق سے ملاقاتیں کافی کم ہو گئیں بلکہ رابطہ تقریباً ختم ہو گیا۔ مگر گاہے بگاہے اسکی خیریت معلوم ہوتی رہتی تھی۔

1990 میں میری پوسٹنگ بہاولپور ہو گئی۔ طارق وہاں پہلے سے ہی موجود تھا۔ ڈائریکٹر لوکل گورنمنٹ بڑی دھڑلے والی پوزیشن تھی۔ ملاقاتوں کا سلسلہ وہیں سے شروع ہو گیا جہاں سے منقطع ہوا تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ محفلیں کبھی غیر آباد ہوئی ہی نہیں۔ دن میں ایک آدھی بار طارق سے ملاقات ضرور ہوتی تھی۔ دفتر میں سارا دن بلیک کوفی پیتا رہتا تھا۔ مجھے بلیک کوفی پینے کی عادت طارق ہی سے شروع ہوئی۔ بہاولپور میں طارق ایک ہر دل عزیز افسر تھا۔ اپنے ماتحتوں سے بڑی مروت سے پیش آتا تھا۔ انکا بے حد خیال رکھتا تھا۔ ویسے ایک زمانے میں افسران اپنے جونیئرز کا بچوں کی طرح خیال رکھتے تھے۔ سول سروس میں روایت تھی کہ جونیئر افسران بالکل گھر کے فرد ہوتے ہیں۔ پورے ڈویژن میں ڈائریکٹر لوکل گورنمنٹ پہلا افسر تھا جسے صوبائی حکومت نے تھری ڈور پجیرو جیپ دے رکھی تھی۔ اکثر ہوتا تھا کہ طارق، دو چار دوستوں کو لیکر چولستان چلا جاتا تھا۔ صحرا میں جیپ ہی کام آسکتی ہے۔ درجنوں بار، طارق کے ساتھ چولستان گیا۔ شام گئے صحرا اور رات کو اسکی خاموشی، قدرت کا وہ نظارہ ہے کہ خدا یاد آجاتا ہے۔ اگر آپ نے خود اپنے آپ سے باتیں کرنی ہوں۔ اپنے آپکے ساتھ وقت گزارنا ہو تو صحرا کی سنجیدگی سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ طارق اور میں طویل عرصے تک بہاولپور رہے۔ طارق وہاں سے لاہور آ گیا اور کسی محکمہ میں ڈپٹی سیکرٹری لگ گیا۔ یہ لاہور میں اسکی واحد پوسٹنگ تھی۔ عجیب بات ہے کہ وہ شہر جو اسکے وجود میں رچ بس چکا تھا، طارق وہاں بہت ہی کم عرصہ رہا۔ ویسے دیکھا جائے تو زندگی بھی یہی چیز ہے۔ جو منزل آپکو پسند ہے اس پر قیام بہت کم مدت رہتا ہے۔ انسانی حیات شروع بھی سفر سے ہوتی ہے اور اختتام کس سفری قافلہ کے پڑاؤ میں ہو، اسکے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہاولپور سے جب لاہور آیا تو طارق لاہور میں ہی تھا۔ بہر حال لاہور آ کر وہ پرانے دوستوں میں وقت گزارنے کی پوری کوشش کرتا تھا۔ یہاں سے طارق پتہ نہیں کیسے بلوچستان ٹرانسفر ہو گیا۔ پنجاب کے ایک سابقہ وزیر اعلیٰ میرے سے خفا ہو گئے اور مجھے بھی بلوچستان بھیج دیا گیا۔ ویسے یہ سزا مجھے بے حد راس آئی۔ بلوچستان میں تین سال رہنے کا وہ نایاب تجربہ حاصل ہوا، جو آج تک میرے لیے یادوں کا اثاثہ ہے۔ کوئٹہ میں پنجاب اور کراچی بدر افسران کثیر تعداد میں موجود تھے۔ مبشر رضا، عارف الٰہی، محسن حقانی، ماما عشرت۔ اوریا اور عشرت پہلے ہی سے کوئٹہ میں موجود تھے۔ ان دونوں نے ابتدائی دنوں میں، ہمارا بے حد خیال رکھا۔ طارق کو چیف منسٹر ہاؤس کے ساتھ والا سرکاری گھر الاٹ ہوا تھا۔ وہ ایک اجتماعی جگہ بن گئی تھی۔ آپ جب بھی اسکے گھر جائیں، وہ خندہ پیشانی سے مہمان نوازی کرتا تھا۔ قہقہے لگتے تھے۔ طویل محفلوں کا دور دورہ تھا۔ ہاں! اس وقت تک طارق کی شادی ہو چکی تھی۔ ایک بہت ہی خوبصورت، گول مٹول سا بیٹا بھی گھر میں موجود تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر چلنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسکا نام ٹنکو رکھا گیا۔ اب ٹنکو بھی ہمارے ساتھ ہوتا تھا۔ کئی بار ٹنکو ڈرائنگ روم میں آ کر ہماری ہنسی مذاق کا سبب جاننے کی کوشش کرتا تھا اور وہیں صوفہ پر سو جاتا تھا۔ اتوار کے دن، ہم تین چار دوست، گیارہ بجے طارق کے گھر جاتے تھے۔ کچن

میں جا کر خود ناشتہ بناتے تھے اور پھر سارے ملکر ناشتہ کی میز پر گھنٹوں گپیں لگاتے تھے۔ کئی بار ناشتہ شام کے تین چار بجے ختم ہوتا تھا۔ طارق کی اہلیہ کی حد درجہ وضعداری تھی کہ ہم سب کا اَز حد خیال رکھتی تھیں۔ انتہائی نفیس خاتون۔ پچھلے برس، انکا بھی انتقال ہو گیا۔ اسلام آباد میں گھر میں بیٹھی ہوئی تھیں کہ ہارٹ اٹیک ہوا اور ایک دم زندگی کی ڈور ٹوٹ گئی۔ مجھے علم ہوا تو دس بارہ دن گزر چکے تھے۔ طارق سے بات ہوئی تو فوری اندازہ ہو گیا کہ وہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ زیادہ دیر طارق سے بات نہ کر سکا۔ افسوس کریں بھی تو کیا۔ لوگ لوٹ کر کبھی واپس نہیں آتے۔ کبھی بھی نہیں۔

بات کوئٹہ کی ہو رہی تھی۔ وہاں بھی طارق اور میں بہترین طریقے سے رہے۔ کچھ دیر بعد پنجاب سے بلوچستان بھیجے گئے افسروں کی ایک اور کھیپ آ گئی۔ اس میں راجہ احسن، رضوان بشیر اور سنبل شامل تھے۔ لازم ہے کہ جب چھ سات لوگ ایک ہی شہر میں، ایک جیسے حالات سے گزر رہے ہوں، تو ملاقاتیں بڑھ جاتی ہیں۔ طارق اور مبشر رضا کے علاوہ کسی کی فیملی بھی کوئٹہ میں نہیں تھی۔ اس اثناء میں مجھے بھی سرکاری گھر مل چکا تھا۔ اب وہاں دوستوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ ڈیڑھ برس کیلئے اس میں تعطل اسلیے آ گیا کہ ڈی سی لورالائی پوسٹ ہو گیا اور وہاں سے کوئٹہ کم آنا جانا تھا۔ بہر حال ڈیڑھ برس بعد کوئٹہ واپس آیا تو زندگی پھر وہی سے شروع ہو گئی جہاں سے تھوڑی دیر کیلئے وقفہ آیا تھا۔ طارق سے ملاقات روزانہ کا لازم ایجنڈا تھا۔ ایک دن ہم دونوں کوئٹہ کینٹ جا رہے تھے۔ آرمی کی چیک پوسٹ پر حسبِ ضابطہ فوجی پوچھ رہے تھے کہ آپ لوگ کون ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ طارق گاڑی سے نکل کر فوجیوں کو بتانے جا رہا تھا۔ یونیفارم میں ملبوس ایک سپاہی مجھے اشارہ کر رہا تھا کہ گاڑی تھوڑی سی آگے لے آؤ۔ اچانک زوردار دھماکہ ہوا۔ ایک چھوٹا سا میزائل اس چیک پوسٹ پر نزدیکی پہاڑیوں سے داغا گیا۔ جو فوجی، مجھے آگے آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میرے سامنے درجنوں حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ وہاں پانچ چھ بندے مارے گئے۔ طارق اور میں کیسے بچے۔ محض ایک حسنِ اتفاق تھا۔ جب ایمبولینس آئی تو طارق اور میں لاشیں اُٹھا اُٹھا کر سٹریچر پر رکھ رہے تھے۔ یہ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ انسان زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ قیامت کا منظر تھا۔ اس ساری صورتحال اور اسکے بعد بھی طارق کی آنکھوں میں کوئی خوف نہیں دیکھا۔ ذاتی کردار میں بہادر انسان تھا۔

ہاں ایک انتہائی اہم بات جو میں بھول نہ جاؤں۔ طارق زمان کے نام کا مخفف ٹی ذی تھا۔ میں بے تکلفی میں اسے ٹی ذی بادشاہ کہا کرتا تھا۔ جو رفتہ رفتہ ٹی ذی باشا بن گیا۔ پرسوں جب فون آیا کہ طارق کا انتقال ہو چکا ہے تو میں اپنی کرسی پر منجمد ہو گیا۔ گزرے ہوئے تیس برس، نظروں کے سامنے تیزی سے گھومنے لگے۔ ایک سال سے وہ کینسر کا مریض تھا۔ اس نے کم از کم مجھے اپنی بیماری کے متعلق کبھی کچھ نہیں بتایا۔ کینسر سے ایک سال خاموشی سے لڑتا رہا اور چند دن پہلے ہار گیا۔ ٹی ذی بادشاہ اب منوں مٹی کے نیچے پڑا ہے۔ وہ تو جان محفل تھا، پتہ نہیں اکیلے اتنا لمبا سفر کیسے گزرے گا۔ ٹی ذی بادشاہ، خدا حافظ۔

راؤ منظر حیات